شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اخلاق و معاشرت اور عصری تناظر

☆ آسیہ کریم

ETHICAL & SOCIAL VIEW POINT OF SHAH WALIULLAH IN CONTEMPORARY PERSPECTIVE

Shah Waliullah Dehlvi is an eminent Muslim scholar of eighteenth century. His distinction was that he reflected over the Islamic system and applied it upon the modern age. He proved that the teachings of Islam cover not only faith, beliefs and rituals of worship but also rule all the aspects of social and moral values of a Muslim. He proved with profound arguments that these fundamental principles prevail and govern the Muslim society and its ethics.

Shah Waliullah had a broad vision and a versatile approach towards the different aspects of political, moral and social behaviors. The most important thing about his contributions is that his views are widely accepted and welcomed by the scholars who came after him.

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ برِصغیر میں قرآنی فکر کے بانی ہیں۔ وہ ایک عالمِ ربانی تھے اور صوفیٔ باصفا بھی...... ان کی عظیم اور نابغۂ روزگار شخصیت کی کئی جہات تھیں...... لیکن نمایاں ترین بات یہ تھی کہ وہ ملّت کے احوال کا مکمل اِدراک اور آگہی رکھتے تھے۔

ان کا دور (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) فکری انتشار اور برِصغیر میں مسلم سلطنت کے زوال کا دور تھا(۱)۔ یہ زوال اور انتشار اتنا ہمہ گیر تھا کہ مسلمانوں کا کوئی طبقہ، حکمران اور عساکر، علماء اور فقہاء، صوفیاء اور عوام...... اس سے محفوظ نہ تھا۔ ان سب حالات کو شاہ ولی اللہ اپنی چشمِ بصارت و بصیرت سے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ انہوں نے اس کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس حقیقت پسندانہ تجزیے میں وہ بالکل درست نتیجے پر پہنچے کہ امتِ مسلمۂ ہند کی ان ساری بیماریوں اور تکالیف و آلام کا منبع اور مصدر ہر سطح پر اور ہر دائرۂ زندگی میں اخلاق کا زوال ہے۔

☆ ریسرچ سکالر علومِ اسلامیہ جامعہ پنجاب، لاہور

شاہ ولی اللہ نے اس ہلاکت آفریں مرض کی تشخیص پر اکتفا نہیں کیا(۲)۔ بلکہ اس کے علاج کے لیے بھی کمرِ ہمت باندھی اور ہر ممکن طریقہ اختیار کیا۔ تنقید کا نشتر بھی استعمال کیا اور ہر گروہ کی خامیاں کوتاہیاں کھول کر اس کے سامنے رکھ دیں...... اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے وسیع دینی لٹریچر، تفسیر، توضیحِ حدیث، فلسفۂ دین، تصوّف اور احسان کی تعلیم اور عملی تربیت کے ذریعے ان کے سامنے وہ شاہراہِ ہدایت واضح کی جو ان کے لیے دنیا اور آخرت کی عزت و سربلندی اور کامیابی کا راستہ کھولتی ہے۔

قرآن بطورِ ضابطۂ حیات:

فلسفۂ حیات کے ضمن میں شاہ ولی اللہ کی فکر کا اولین مرکز قرآنِ حکیم ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ اس کتاب نے اپنے اولین پیرووں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ان کی سیرت، ان کے اَخلاق اور ان کے تمدن کو بالکل بدل کر رکھ دیا اور پھر انہیں دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کیا کہ وہ عالمِ انسانیت کے قائد اور رہنما بنیں (۳)۔ تہذیبِ نفوس کے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو قرآنِ مجید کے مضامین میں بڑا تنوّع ہے۔

سید مودودیؒ کے بقول:

یہاں ”اعتقادی مسائل، اَخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، تخویف، ملامت، بشارت، تسلّی، دلائل، شواہد، تاریخی قصص، آثارِ کائنات کی طرف اشارے...... بار بار ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں“(۴)۔

دل کی بیداری، بندگی و عبودیت کے احساسات کے استحضار کا سامان اور اَخلاقی تربیت کے رہنما اصول اس کتابِ ہدایت کے ورق ورق پر ثبت ہیں۔

مسلمانانِ ہند کے ”احوالِ واقعی“ شاہ ولی اللہ کے سامنے تھے۔ عالمِ اسلام کے حالات سے بھی وہ بے خبر نہ تھے کہ حجازِ مقدس میں ایک سال سے زیادہ عرصہ گزار کر آئے تھے جہاں سید

ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول: ''اس زمانے کے عالمِ اسلام کے دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی تھیں''(۵) اپنے دور کے حالات میں انہوں نے دوبارہ اسی نسخۂ شفا سے رجوع کرنے کی دعوت دی جسے مسلمانانِ ہند فراموش کیے بیٹھے تھے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾(۶)

انہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے ہر طبقے کے لیے یہی ''نسخۂ قرآن'' تجویز کیا۔ اس کے فہم اور تدبر کی طرف توجہ دلائی۔ بچوں کے لیے تو خاص طور پر نصیحت فرمائی کہ ابتدائی دورِ عمر ہی میں اگر وہ اس کے معنی ومفہوم سے ایک مرتبہ گزر جائیں ......تو یہ نقوش ان کی لوحِ ذہن پر ہمیشہ مرتسم رہیں گے(۷)۔ خود مدرسے میں انہوں نے طلبۂ علومِ دینیہ کے لیے تعلیمِ قرآن کا جو طریقہ اختیار کر رکھا تھا ......اور اپنے ذاتی تعلیمی تجربے سے اسے نافع پایا تھا......اس طریقِ تعلیم کی اپنی وصیت میں بھی تلقین کی، فرمایا:

''قرآن کا درس اس طرح دیں کہ صرف قرآن پڑھائیں، بغیر تفسیر کے، ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے جائیں۔ جہاں کوئی نحو یا شانِ نزول کا مشکل مسئلہ آئے، وہاں ٹھہریں اور اس پر بحث کریں۔ درس سے فارغ ہونے کے بعد درس میں جتنا قرآن پڑھا گیا ہو، اس کی مقدار کے مطابق جلالین پڑھائیں، اس طرح پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں''(۸)۔

اس طریقے سے خود قرآن پڑھا جائے یا اس کی تعلیم وتدریس کی جائے، تجربہ کرنے والے آج بھی اس کے فوائد کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کلامِ الٰہی کے الفاظ اور مفہوم تو ایمان نہ رکھنے والوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیتے تھے۔ ان کے چہرے متغیر ہوجاتے تھے''(۹)...... یہاں تو معاملہ مسلمانوں کا تھا جنہیں شاہ صاحب قرآن فہمی کی تلقین فرما رہے تھے۔ تلاوت، تدبر اور تفکر کے ذریعے قرآن سے جوڑنا چاہ رہے تھے۔

تفسیر جلالین کے اختصار سے شاہ صاحب نہایت متاثر تھے[۱۱]۔ غالباً اس احساس کے پیشِ نظر کہ قاری کئی تاویلات کے چکر میں پڑے بغیر محض ایک آدھ لفظ میں آیت کا مفہوم اخذ کر لیتا ہے، جو تلاوتِ قرآن کا اصل مقصود ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے فتح الرّحمٰن کے حواشی بے حد مختصر رکھے۔ اکثر دو تین لفظوں میں کسی مفہوم کو واضح کر دیا اور یہ بھی وہاں، جہاں ضروری سمجھا۔ ورنہ فتح الرّحمٰن کے کئی کئی ورق پلٹ جایئے کم ہی حاشیے لکھے ملیں گے۔ البتہ کہیں کہیں مختصر تشریح بھی کی۔

معاشرتی واخلاقی مسائل پر قرآنی آیات کی تطبیق

خدمتِ قرآن کے ضمن میں شاہ صاحبؒ کی کتاب الفوز الکبیر قرآنِ مجید کا ایک مجموعی تعارف پیش کرتی ہے۔ اس مختصر کتاب میں بیان کردہ موضوعاتِ قرآنی کی ایک سادہ تقسیم بجائے خود تفہیم کا بہت کچھ سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ الفوز الکبیر کے مطالعے کے بعد قرآنِ مجید سے سرسری گزرنا ممکن ہی نہیں رہ جاتا کہ شاہ صاحبؒ نے آیات کا تعلق ہر قاری کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں: قرآن منافقوں کا تذکرہ کرتا ہے، ان سے مخاصمہ کرتا ہے......تو کیا یہ سمجھا جائے کہ منافقین صرف مدینے کے اس معاشرے میں ہی پائے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیات آج بھی عبرت ونصیحت کے باب میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنا کہ نزولِ قرآن کے وقت۔

الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں منافقوں کے اعمال اور اَخلاق کی حقیقت کھول کے رکھ دی ہے۔ اور منافقوں کے دونوں گروہوں (قلبی منافق اور عملی منافق) کے بارے میں بہت سی باتیں بیان کی ہیں تاکہ امت باخبر رہے اور ان لوگوں سے پرہیز کرے......اگر آپ منافقوں کے نمونے اس زمانے میں دیکھنا چاہتے ہیں تو امیروں اور رئیسوں کی محفلوں میں تشریف لے جایئے اور ان

کے مصاحبوں کا تماشا دیکھئے۔ وہ لوگ کس طرح اپنے آقاؤں کی مرضی کو پیغمبرِ اسلام صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہ کی رائے و مرضی اور شریعت کے حکم پر فوقیت دیتے ہیں۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے کے منافق، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں براہِ راست سنتے تھے اور نفاق برتتے تھے......اور اس زمانے کے منافقین میں، جو قطعی طور سے شارع علیہ السلام کی مرضی اور اس کا حکم معلوم ہو چکنے کے بعد اس کے خلاف اقدام کرتے ہیں، کوئی فرق نہیں ہے''(۱۱)۔

آگے چل کر واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ایسی آیات کا مقصد اس زمانے کے بُرے لوگوں پر تا قیامت تبرّے بھیجتے رہنا تو نہیں تھا۔ یہ بات نزولِ قرآن کے مقاصد سے بعید تر ہے۔ مقصود تو یہ ہے کہ ان اعمال و اخلاق سے احتراز کیا جائے جن کی وجہ سے یہ گروہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ قرار پایا ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

''منافقین کی اس حالت کے پیشِ نظر آپ کا فریضہ یہ ہے کہ جب قرآنِ مجید کی تلاوت کرنے بیٹھیں تو یہ ہرگز مت سمجھیں کہ یہ سب کچھ کسی ایسی قوم سے خطاب ہے جو کسی زمانے میں موجود تھی اور اب فنا ہو گئی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سامنے رکھیے کہ تم بھی گزشتہ لوگوں کے راستے پر چلو گے......اور یقین کریں کہ آج دین میں ایسی کوئی آفت نہیں ہے کہ پہلے سے جس کا نمونہ موجود نہ ہو''(۱۲)۔

نصاریٰ کا نمونہ بھی انہیں امتِ مسلمہ میں مل جاتا ہے۔ وہ جو اولیاء اللہ اور اپنے بزرگوں کو فوق البشر جانتے ہیں ''بس ظاہراً خدا نہیں کہتے، لیکن ان کی جن صفات اور کمالات کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں خدا سے پست بھی نہیں ہونے دیتے''(۱۳)۔

یہودیوں کے اَخلاق و کردار پر قرآنِ مجید میں جابجا تبصرہ کیا گیا ہے۔ وہ کتمانِ آیات، تحریفِ آیات، بد عملی اور سنگین بداَخلاقیوں کے مجرم تھے(۱۴)۔ ان کے علماءِ سوء اس معاملے میں اپنی

قوم سے دو ہاتھ آگے، اور معمولی دنیوی منافع کے لیے عوام کی غلط رہنمائی کے دوہرے مجرم تھے...... شاہ ولی اللہ نے اس آئینۂ قرآنی میں مسلم علماء، فقہاء اور مقتدا حضرات کو اپنا کردار اور عمل ملاحظہ فرمانے کی دعوت دی(۱۵)۔

شاہ صاحبؒ نے علومِ قرآنیہ پر عملیت کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی اور جگہ جگہ واضح کیا کہ قرآن کا اُسلوبِ بیان اس وضاحت کے لیے کافی ہے کہ اس کا مقصود کیا ہے۔ اس کے مضامین میں **''تکرار''** اس لیے ہے کہ مدّعا قاری کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اس کی دلچسپی اور شوق برقرار رکھنے کے لیے تکرار کے باوجود جگہ جگہ اُسلوب اور طرزِ بیان بدل جاتا ہے(۱۶)۔

''شانِ نزول'' کی روایات بھی چند خاص مقامات کے علاوہ شاہ صاحب کے خیال میں غیر ضروری ہیں کہ اصل مقصود تو قرآن کے حکم کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہے۔ شانِ نزول خاص بھی ہو، تو علمائے امت کا اتفاق ہے کہ حکم عام ہے(۱۷)۔ **''اُسلوبِ بدیع''** اس لیے اختیار کیا گیا کہ کلام کی دلکشی سامع کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لے(۱۸)۔ **''انتشارِ مضامین''** اس لیے تھا کہ جن عربوں پر یہ کلام اُتارا گیا، وہ اسی اُسلوب کے عادی تھے، اور یہ کہ اس کا دلنشین طرزِ بیان انہیں اجنبی محسوس نہ ہو(۱۹)۔ اور **''قرآنِ حکیم کا اعجاز''** دیگر تمام پہلوؤں کے ساتھ، سب سے بڑھ کر اس کی تعلیم میں تھا۔ حقوق وفرائض، اَخلاق وتمدن اور مسائلِ حیات کا ایسا متوازن اور قابلِ عمل ضابطہ پیش کرنے سے انسان آج تک عاجز ہیں(۲۰)۔

یوں، قرآنِ حکیم کو مسلمانوں کے ہر مرحلۂ زندگی میں دخیل اور اَخلاق وعمل اور معاشرت کے دیگر پہلوؤں کے باب میں اولین رہنمائی کا مقام عطا کرنا شاہ ولی اللہ کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ برِصغیر کی حد تک، شاہ صاحبؒ سے پہلے کم ہی لوگوں نے قرآنِ مجید کو اس طرح سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

حدیثِ نبویؐ...... معاشرت کے بنیادی اصولوں کی عملی تعلیم:

حدیثِ نبویؐ کے پڑھنے پڑھانے کا برِصغیر میں عام رواج نہ تھا۔ ایران و عراق اور **ماوراء النھر** سے آنے والے اپنے ساتھ یہاں فقہی اور کلامی بحثوں کا ذخیرہ لائے تھے(۲۱)۔ خود ہندوستان کی مسلم سلطنت کی ضروریات ایسی تھیں کہ حکومتی محکموں کے لیے فقہاء کی ضرورت رہتی تھی(۲۲)، یا پھر ہندوؤں اور دیگر ہندی مذاہب کا اثر تھا کہ صوفیاء کی خوب آؤ بھگت ہوتی تھی(۲۳)۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ نے یہاں حدیث کا تذکرہ شروع کیا...... لیکن بالآخر ان کی اولاد بھی مناصبِ قضا کی طرف چلی گئی اور یہ میدان پھر سے خالی ہو گیا(۲۴)۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ شرف شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے لیے مقدر تھا کہ انہوں نے اس خلوص کے ساتھ اس تذکرے کو زندہ کیا کہ آج بھی برِصغیر کی فضاؤں میں اس کی گونج باقی ہے۔ اور ''برصغیر میں روایتِ حدیث کے تقریباً ننانوے فیصد سلسلے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان پر ختم ہوتے ہیں''(۲۵)

شاہ صاحبؒ کی تحریروں اور خاص طور پر حجۃ اللہ البالغہ سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تمدنی زندگی کی درست اور عملی رہنمائی حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی میسر آ سکتی ہے...... خاص طور پر اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کے باب میں...... کہ خود اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گواہی دی ہے ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾(۲۶)۔

شاہ صاحبؒ کے خیال میں قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہؐ، دونوں کے امتزاج سے اسلام کا وہ منفرد نظامِ حیات تشکیل پاتا ہے جو اخلاقِ حسنہ کی محض آبیاری ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے محرک بھی بنتا ہے۔ اطاعتِ رب، خشوع و خضوع، طہارت و اخبات، سماحت و عدالت، سبھی اوصاف کی

تائید وتشریح کے باب میں شاہ ولی اللہ حدیثِ نبوی کے خوشہ چین ہیں۔ کسی اخلاقی صفت کے مختلف پہلو بیان کرنے ہوں تو وضاحت کے لیے مسلسل احادیث درج کرتے جاتے ہیں یا ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً البدور البازغة میں اخلاقِ حسنہ اور رذائلِ اخلاق کے بارے میں ان کا طرزِ تحریر ملاحظہ ہو:

”نبّہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم علی الاخلاق الصّالحة واضدادھا، فقال: انّ اللّٰہ تعالیٰ یلوم علی العجز فعلیک بالکیّس ......لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین......شرّما فی الرّجل شحّ ھالع وجبن خالع......خصلتان لا یجتمعان فی مؤمن، البخل و سوء الخلق......لا یدخل الجنّة خبّ ولا بخیل ولا منّان......المؤمن غرّ کریم، والفاجر خبّ لئیم......الحیاء من الایمان......الحیاء خیر کلّہ......السخیّ قریب من اللّٰہ، قریب من الجنّة قریب من النّاس، بعید من النّار، والبخیل بعید من اللّٰہ، بعید من النّاس، قریب من النّار......انّ من البیان سحرا......“(۲۷)۔

یہ احادیثِ نبوی اپنے مقصود ومدعا کے بیان میں اتنی واضح ہیں کہ شاہ صاحب ان پر تبصرہ بھی نہیں فرماتے......حسنِ اخلاق کے باب میں حجۃ اللہ البالغہ میں بھی وہ اسی طرح ایک موضوع کے بارے میں احادیث جمع کردیتے ہیں......مثلاً صبر، توکل، زہد، آفات اللّسان، جود وسخا، قصرِ امل، غیظ وغضب، تکبر، تواضع، عدل اور مسلمانوں میں باہمی ہمدردی ومواساۃ وغیرہ(۲۸)۔

ابوابِ احسان میں جس طرح شاہ صاحب نے **قصرِ امل** کے بارے میں احادیث درج کی ہیں......اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں......فرماتے ہیں:

”**قصرِ امل** کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ ”دنیا میں اس

طرح رہو گویا مسافر ہو یا راہ رو۔" ایک مرتبہ آپ نے زمین پر ایک مربع کھینچا اور اس کے عین وسط میں ایک لکیر کھینچی جس کا سرا اس مربع سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اس وسطی خط کے دونوں طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترچھی لکیریں لگائیں اور فرمایا...... "یہ درمیانی لکیر انسان کی مثال ہے، جس کو چاروں طرف سے اجل نے گھیر رکھا ہے۔ یہ لکیر کا باہر نکلا ہوا سرا اس کی درازیٔ امید کی مثال ہے (جو اجل کی حدوں سے بھی آگے نکل جاتی ہے) یہ چھوٹی چھوٹی لکیریں اس کی موت کے اسباب ہیں۔ اگر ایک سے بچ گیا تو دوسرے سے اس کا بچنا دشوار ہے۔ اگر اس کی زد سے بھی محفوظ رہا تو تیسرے چوتھے کا نشانہ خطا نہیں جائے گا۔"...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طولِ امل کا علاج یہ بتایا ہے کہ "موت کو بہت یاد کیا کرو۔ قبروں کی زیارت کو جاؤ اور ان سے عبرت حاصل کرو...... اپنے ہم عمروں کو مرتا دیکھ کر اس سے اپنی موت کا سبق لو"...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "کوئی شخص مرنے کی آرزو نہ کرے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے اپنی موت کے لیے دعا مانگے کیونکہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے"(۲۹)۔

محض چار احادیث میں شاہ صاحبؒ نے موضوع کا پوری طرح سے احاطہ کر لیا ہے...... حالانکہ کوئی تبصرہ یا تفصیلی تشریح نہیں فرمائی...... پہلی تین احادیث میں طولِ امل کی مذمّت کی، اس کا خاکہ کھینچا اور آخری حدیث میں تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی روشنی ڈالی اور عمرِ عزیز کی قدر وقیمت واضح کی۔

اسوۂ حسنہ بطورِ محرّکِ اخلاق:

حدیثِ نبوی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں تعلیم کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا عملی نمونہ بھی ملتا ہے جو اخلاقِ حسنہ کا ایک مؤثر محرک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد اخلاقی کی ہر شکل کی مذمّت کے ساتھ حسنِ عمل کی تعلیم اپنے کردار اور عمل سے بھی دی۔ جھوٹ، بد دیانتی، خیانت وغیرہ کو ناپسند فرمایا۔ اس سے بچنے کی نصیحت فرمائی...... دوسری

طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے معمولات میں تواضع، نرمی، ہمدردی اور تعاون، ساتھیوں سے محبت اور بے تکلفی اور باہمی تعلقات میں خوشگواری کے رنگ بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔ عرب کے بے باک معاشرے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرم وحیا کو خوبی کہا...... حیا کے بارے میں اپنے بھائی کو ملامت کرنے والے صاحب کو روکا کہ حیا تو جتنی ہو، اتنی ہی اچھی ہے...... اور خود اپنا طرزِ عمل ایسا رکھا کہ قریبی ساتھی بتاتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنواری لڑکی سے بڑھ کر حیادار تھے۔ (کان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اشدّ حیاء من العذراء)(۳۰)۔ اس ان گھڑ معاشرے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی معاملات، تجارت اور بیع کے آداب و اخلاق سکھائے، صلح و جنگ کے آداب، معاشرت اور خانگی زندگی کے آداب، عبادات، ذکر اور دعا کا سلیقہ، دین اور دنیا میں توازن کی تفصیلی ہدایات اور عملی نمونہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے اخذ کیا۔ اسی لیے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی بجا طور پر کہتے ہیں کہ ''سیرتِ نبویؐ کے بیان میں شاہ ولی اللہ نے مصادرِ سیرت (ابن اسحاق وغیرہ) کی بجائے روایاتِ حدیث سے استفادہ کیا ہے''(۳۱)۔

یہ ایک اہم تبدیلی تھی جو بعد کے مصنفین کے لیے رُجحان ساز ثابت ہوئی اور مطالعۂ سیرت میں زیادہ مستند اور تحقیقی اعتبار سے زیادہ مضبوط مؤقف کے سامنے لانے میں مددگار بنی...... جو دورِ حاضر کا خاص اُسلوب ہے۔

فلسفۂ معاشرت و اجتماع:

اخلاق کا اصل میدانِ کار اجتماعی زندگی کے روابط اور تعلقات ہیں۔ ایک سادہ اور چھوٹے اجتماع کی سیاست کاری سے لے کر خلافتِ عظمیٰ تک کے لیے وہ ایک لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ حکام کے لیے عدلِ اجتماعی پر مبنی دستور کی تیاری کو ضروری ٹھہراتے ہیں۔ سلطنت کے اہم اور نمایاں شعبوں کے قیام اور ان کے طریقِ کار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ افرادِ کار کے انتخاب اور احتساب کے

اُصول و قواعد بیان کرتے ہیں۔ ان کی اس سیاسی سوجھ بوجھ کو سید حسن ریاض نے اپنی کتاب ’’پاکستان ناگزیر تھا‘‘ میں ان الفاظ میں داد دی ہے کہ احمد شاہ ابدالی کو چاہیے تھا کہ پانی پت کی جنگ کے بعد حکومت دوبارہ نا اہل مغل حکمران کو سونپ کر واپس جانے کی بجائے...... ’’ایک معقول جیب خرچ کے ساتھ شاہ عالم کو آئینی بادشاہ کی حیثیت سے برقرار رکھتا اور تمام اختیاراتِ حکومت ایک مجلسِ وزراء کے سپرد کرتا جس کے صدر حضرت شاہ ولی اللہ ہوتے اور وزیرِ جنگ نجیب الدولہ ......تو ہندوستان کے مسلمان تباہی سے بچ جاتے ......۔(۳۲)‘‘۔

اگرچہ شاہ ولی اللہ کا دور...... مغرب میں بھی معاشرتی علوم (Social Sciences) کی لا دینی تشکیلِ جدید اور نت نئے خیالات و افکار کی گرم بازاری کا دور تھا، لیکن انہوں نے اجتماعیت کی بنا ’’انسانیت‘‘ کے پائیدار رشتے پر رکھی اور خالقِ انسانیت کی انبیاء کرام کے ذریعے دی جانے والی رہنمائی کی روشنی میں اجتماعی اداروں کی تشکیل پر زور دیا۔ ان کی مثالی ریاست کے نقشے میں قضا و عدلیہ اور معاشرت و معیشت کی ترقی کے اہتمام کے ساتھ...... حکّامِ وقت، امر بالمعروف، نھی عن المنکر اور اصلاحِ اخلاق کے فریضے سے ایک لحظہ بھی غافل نظر نہیں آتے (۳۳)۔

اَخلاق کو اس اجتماعی زندگی میں وہ اتنا اہم قرار دیتے ہیں کہ ان کے خیال میں کوئی قوم مادّی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کر جائے، بڑی بڑی سیاسی فتوحات حاصل کر لے، ’’علومِ ارتفاقات‘‘ (مادی اور سائنسی علوم کو وہ یہی نام دیتے ہیں) میں دوسری قوموں سے بڑھ جائے...... لیکن ایک ارتفاق سے دوسرے ارتفاق میں ترقی کرتے ہوئے اگر وہ تمدنی ترقی کے حسبِ حال اخلاق اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی تو گویا اس کی یہ مادی ترقی ناقص ہے۔ یہ نقص اور کمی مادی، سیاسی اور تمدنی زندگی کے عروج کی انتہائی منزلوں تک (اگر وہ وہاں پہنچ سکی تو......!) اس کے ساتھ چلے گی (۳۴)۔ اور اس کے لیے یہ کہنا بجا ہوگا۔

تا ثریا می رود دیوار کج

ارتفاقات کی اس بحث کا ترجمہ کرتے ہوئے "البدور البازغة" کے فاضل مترجم نے اپنے حاشیے میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے "اشراط الساعة" میں سے ایک علامت مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی زوال اور پستی کو قرار دیا تھا۔

وہ لکھتے ہیں:

"حدیث میں قربِ قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ ایسے لوگ جو پیروں ننگے، بدن کے لباس میں ادھورے اور تمدن میں بھیڑوں کے چرواہے ہوں گے، ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عمارات بنانے کا اہتمام کریں گے"(۳۵)۔

تاریخِ عالم......اور خاص طور پر آج کل کے عالمی حالات شاہ ولی اللہ کے اس نظریے کی توثیق کرتے ہیں کہ قوموں کی بے مہار اور اخلاقی قیود سے آزاد مادی ترقی اور سیاسی قوت، عالمِ انسانی کے لیے اور خود ان کے اپنے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا(۳۶)

معاشرتی بگاڑ اور تاریخ کا سبق

انسانی تاریخ میں اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے مادی عروج اور اَخلاقی زوال کا نمونہ کئی قوموں نے پیش کیا اور تاریخ کے صفحات پر اپنی داستانِ عبرت چھوڑ گئیں۔ قرآنِ مجید نے گزشتہ قوموں کے جو قصص بیان کیے وہ اسی اٹل حقیقت کے بیان اور ان واقعات سے عبرت پذیری کے لیے تھے، جنہیں شاہ ولی اللہ "**تذکیر بایّام اللّٰہ**" کے عنوان کے تحت مضامینِ قرآن کا ایک اہم حصہ قرار دیتے ہیں(۳۷)۔

اجتماعی زندگی کا اخلاقی زوال اسی لیے شاہ صاحب کے خیال میں انفرادی اخلاقی زوال سے بڑھ کر بربادی اور ہلاکت کا سبب بنتا ہے...... تاہم وہ اجتماعیت کی بات کرتے ہوئے بھی ''فرد'' کی اہمیت کو فراموش نہیں کرتے۔ افراد، ان کے خیال میں معاشرے کی بنیادی اکائی ہیں...... ان کی اخلاقی تربیت کا معاشرتی ادارات کی ہر سطح پر (گھر، خاندان، محلّہ، ریاست اور مملکت وغیرہ) اہتمام اور نگرانی ضروری ہے(۳۸)۔ شاہ ولی اللہ نے افلاطون کی سی خیالی ریاست (Utopia)(۳۹) کا نقشہ نہیں بنایا لیکن اپنے ذہن میں آنے والے ایک مثالی ریاست کے خدوخال کو نوکِ قلم پر لانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان کا خیال ہے کہ ایک مثالی ریاست تب ہی تشکیل پاتی ہے جب ساری دنیا کے انسان یا کم از کم ان کی اکثریت خلافتِ عظمیٰ کے ماتحت ہوں(۴۰)۔ انسانیت کے رشتے میں پروئے جائیں (بنو آدم و آدم من تراب)(۴۱) اور سب اخلاقِ عالیہ کے پابند ہوں...... یعنی طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت...... یہ خلافت، عالمِ انسانیت کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے(۴۲)۔

نظریۂ ارتفاقات:

فلسفۂ اجتماع بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی سماجی فکر کو ایک نئے عنوان سے پیش کیا ہے۔ یعنی ''ارتفاقات''۔ یہ ان کی طبع زاد اصطلاح ہے(۴۳)۔ انہوں نے اجتماعی زندگی کو انسان کے فطری تقاضوں میں شمار کیا(۴۴)۔ اور ارتفاقات کی ہر منزل میں اور ہر مرتبے پر اخلاقی نظام کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

تاریخی اعتبار سے یہ مماثلت بڑی عجیب ہے کہ مغرب کے عسکری غلبے کے ساتھ فکری تحقیقات کا آغاز بھی تقریباً اسی دور میں ہوا جب شاہ ولی اللہ ہندوستان میں اپنے نتائجِ فکر قلم بند کر رہے تھے(۴۵)۔

ڈاکٹر خالد علویؒ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جس وقت سیاسی و عمرانی اُمور پر اظہارِ خیال کیا ہے، اسی وقت ہابز(Hobbes) اور لاک(Locke) سیاسی و عمرانی موضوعات پر لکھ رہے تھے...... جب یہ انگریز، منکرِ خدا تہذیب کے خدوخال مرتب کر رہے تھے، اس وقت شاہ ولی اللہ الہامی بنیادوں پر سیاسی و معاشرتی تنظیم کے نقوش واضح کر رہے تھے''(۴۶)۔

اہلِ مغرب اس سوال پر بحث میں مصروف تھے کہ فرد اور معاشرے میں سے ''اصل'' کیا ہے اور ''اہم'' کون ہے؟ اور یہ کہ معاشرے کے مفاد پر افراد کے انفرادی رجحانات، ذوق اور صلاحیتوں کو بھینٹ چڑھایا جائے...... یا فرد کی لامحدود آزادی کے احمقانہ نظریے کی آڑ میں اجتماع کی جڑوں پر تیشہ چلا دیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ''دانشِ افرنگ'' اس اُلجھے ہوئے مسئلے کا حل نکالنے سے آج تک قاصر ہے۔

علامہ اقبالؒ، شاہ ولی اللہؒ کے **''ارتفاقات''** کے اس نظریے سے بے حد **متاثر** تھے کہ شاہ صاحبؒ نے اس سارے مسئلے کو شریعت کی اصولی رہنمائی کی روشنی میں اتنے سادہ اور فطری انداز میں پیش کیا ہے گویا اس مسئلے کی ''شاہ کلید'' شریعت ہی کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ کہیں نہیں ہے۔ مغرب کے فلسفے، معاشرتی تحقیقات اور قانون وغیرہ پر علامہ اقبال کی گہری نظر تھی، مطالعے کے سبب بھی اور مشاہدے کی وجہ سے بھی...... اور وہ دیکھ رہے تھے کہ دین کی قید سے آزاد یہ فکر، انسانیت کے لیے آلام و مصائب کا سبب تو بن سکتی ہے، کسی راحت اور آسانی کا نہیں...... **محمد حامد** اپنی کتاب ''افکارِ اقبال'' میں لکھتے ہیں کہ ''علامہ نے اپنے خطوط، اپنے دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں اور مختلف خطبات میں کئی موضوعات کی جانب توجہ دلائی...... انہیں میں سے ایک موضوع تھا...... ''حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خصوصی مطالعہ بحوالہ ارتفاقات''(۴۷)۔

سید مودودیؒ بھی اس باب میں شاہ صاحبؒ کے معترف ہیں کہ ان کے ''اجتماعی فلسفے کی

بنیاد اخلاق پر اُٹھائی گئی ہے''(۴۸)۔ ڈاکٹر بشارت علی تو صاف کہتے ہیں کہ اہلِ مغرب ''اقدار'' (Values) پر مبنی معاشرت کی باتیں تو بہت کرتے ہیں۔ اقدار ہیں کیا؟ یہ طے نہیں کر سکے۔ اپنی کتاب "Muslims, The First Sociologists" میں لکھتے ہیں:

"We have no hesitation to say that the scholars today, while diagnosing and suggesting therapeutic measures, certainly refer to social values, but in this respect one is susceptible to believe that the idea of values or social norms is not clear to the western scholars. At times, the definitions of social values as given by them are at best dichotomous and contradictory."(۴۹)

ماہرین علم الاخلاق کی اکثریت اس بات سے اتفاق کرتی ہے کہ مستقل اور پائیدار اخلاقی اقدار، دین کے علاوہ کہیں اور سے نہیں ملتیں۔

"The Elements of Moral Phiolosphy کا مصنف James Rachel اخلاقی تصورات کے کئی ممکنہ مآخذ پر بحث کرنے کے بعد جب مذہب، تصورِ خدا اور آخرت تک پہنچتا ہے تو بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ خدائی حکم کا نظریہ (The Divine Command Theory) ہی بہترین اخلاقی نظریہ ہے:

"This conception has a number of pleasing features. It immediately solves the old problem about the subjectivity/objectivity of ethics. According to this theory, ethics is not merely a matter of personal feelings or social custom. Whether something is right or wrong is a perfectly objective matter: it is right if God commands it, wrong if God forbids it. Moreover, this Divine Command Theory suggests an answer to the perennial question of why anyone should bother with morality. Why not just look out for one's own

interests? If immorality is the violation of God's commandments there is an easy answer on the day of final reckoning, you will be held accountable."(۵۰)

انسانی فطرت بطورِ مصدرِ اخلاق:

فطرتِ انسانی، شاہ ولی اللہ کے خیال میں بنیادی اور اہم مصدرِ اخلاق ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے بیان میں بار بار اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ ہر بچہ ''فطرت'' پر پیدا ہوتا ہے (كلّ مولود يولد على الفطرة......فابواه يهوّدانه وينصّرانه ويمجّسانه)(۵۱)۔

شاہ صاحب کی فکر کے شارحین اور محققین صراحت کرتے ہیں کہ ان کا پیش کردہ نظامِ اخلاق فطرتِ انسانی کے اعتبار سے مرتب کردہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالواحد ھالے پوتہ کہتے ہیں کہ ''شاہ ولی اللہ اخلاقیات کے منابع (Sources) مذہب میں نہیں، فطرتِ انسانی کے تقاضوں میں تلاش کرتے ہیں(۵۲)۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے خیال میں یہ بڑی اہم بات ہے۔ شاہ صاحب کی اس تعبیر پر مذہب و ملت کے اختلافات کے باوجود، ساری انسانیت کو بآسانی جمع کیا جاسکتا ہے(۵۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب (شاہ صاحب اس سے اسلام ہی مراد لیتے ہیں) کوئی ضوابط اور اصول، انسانوں کے احوال اور ان کی فطرت کے تقاضوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے......ان پر مسلّط (Impose) نہیں کرتا۔ اپنی تحریروں میں شاہ صاحب دلائل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں کہ دینی ضابطے دراصل نوعِ انسانی کے فطری تقاضوں کو ان کے مناسبِ حال قواعد کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ انسان کے فطری تقاضے انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی، جسمانی بھی ہیں اور روحانی بھی......مذہب ان سبھی تقاضوں کو نقطۂ عدل پر جمع کرتا ہے اور شریعت کی صورت میں تمام انسانوں کو ایک اجتماعی ضابطے کا پابند بناتا ہے(۵۴)۔

اس کی مثالیں سطعات میں، حجة الله البالغه، البدور البازغة میں، اور الطاف

القدس وغیرہ میں عام ملتی ہیں۔ مثلاً عبادت کے رجحان کو شاہ ولی اللہ نے انسانی فطرت قرار دیا ہے۔ معبود، خواہ کوئی بھی ہو، اس کے سامنے عاجزی اور تذلل اختیار کرنا، اس کی خوشنودی کے لیے خرچ کرنا، اس کے گھر کی زیارت کرنا، اس کی خاطر بھوکا پیاسا رہنا اور مشقت برداشت کرنا وغیرہ، عبادت کی مختلف صورتوں کے یہ عام مظاہر ہیں(۵۵)۔ جب ان عبادات کو انسان خود اپنے لیے طے کرتے ہیں تو ان کا ذوق، افتادِ طبع، معاشرتی اور معاشی حالات کا اثر ان میں نمایاں ہوتا ہے۔ کہیں عبادت کے نام پر گانا بجانا اور حیا باختہ رقص، کہیں خود اذیتی، کہیں رہبانیت، تپسیائیں اور ایسی ریاضتیں، جو جسم کو گھلا کر رکھ دیں، اور کہیں بنامِ خدا ظلم اور خونریزی تک عبادات میں شامل ہو گئیں......ایسے میں شاہ صاحبؒ کے خیال میں مذہب ہی ہے جو اس رجحان کو صحیح رُخ دیتا ہے(Channalize کرتا ہے) کم از کم مقدارِ عبادت کا بھی تعین کرتا ہے مثلاً فرض نماز کی رکعات، روزوں کا ایک مہینہ، زکوٰۃ کا نصاب، وغیرہ وغیرہ کہ انسان کے روحانی اور جسمانی تقاضوں کی عدل کے ساتھ تکمیل ہو سکے۔

شاہ صاحبؒ کے بقول شریعت کا طے کردہ ضابطہ فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر طے کیا گیا ہے۔ عبادات کی کم از کم مقدار اس لیے متعین کی گئی کہ اس سے کم میں روحانی تربیت اور فطری رجحان کی تسکین ممکن نہیں ہے(۵۶)۔ اور ایک حد سے آگے بڑھنے سے اس لیے منع کیا کہ اس میں انسان اپنے جسمانی یا معاشرتی تقاضوں کا حق ادا نہیں کر سکے گا اور رہبانیت کی طرف نکل جائے گا جو فطرت کے خلاف ہے۔ ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان اس کا حق بھی ادا نہیں کر سکتا۔ ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾(۵۷)۔

تمدّنی ضوابط کی تشکیل اور فطرتِ انسانی

اخلاق......انسان کی اجتماعی زندگی کی ضرورت ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے خیال میں اخلاق بھی انسان کے لیے، بلاقیدِ مذہب و ملت، اتنے ہی فطری ہیں جتنی اجتماعی زندگی......وہ ایک بڑی

دلچسپ مثال سے اس کی وضاحت کرتے ہیں.....ان کے بقول.....بفرضِ محال، کوئی حادثہ کسی انسان کو اگر کسی ویرانے میں، یا جنگل میں تنہائی کی زندگی بسر کرنے کے لیے چھوڑ دے.....تو جس شدّت سے وہ غذا، گرمی سردی سے بچنے اور ستر ڈھانپنے کے لیے کسی قسم کا لباس اور سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ تلاش کرے گا.....اتنا ہی اضطراب وہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کسی ساتھی (بلکہ زوج) کی تلاش کے لیے بھی ظاہر کرے گا۔ اور اگر وہ دیگر ضروریات بہم پہنچا بھی لے.....تو بھی بے چینی اور پریشانی میں مبتلا رہے گا.....سرگرداں اور مضطرب رہے گا.....اور حسنِ اتفاق سے یہ رفاقت اسے میسر آجائے تو شاہ صاحب کے خیال میں اجتماعیت کا سامان ہو گیا.....''اجتماعیت'' کے اس ''لالے کی حنا بندی'' کا کام فطرت اپنی رہنمائی میں خود بخود کروائے گی۔ اولاد، خاندان اور قبیلے کے ساتھ، وقت گزرنے پر کسی نہ کسی قسم کی اجتماعیت وجود میں آجائے گی۔ محبت، تعلق اور ذمہ داری کے احساسات اُبھر آئیں گے اور ارتفاقِ اول کی سطح پر ہی تجاربِ حیات، انسانوں کے اس مختصر گروہ کو بھی کسی ضابطۂ اخلاق (خواہ وہ کتنا ہی سادہ اور کم درجے کا ہو) پر متفق کر دیں گے(۵۸)۔ اور مولانا مودودیؒ کے بقول: ''مدنیت کی ترقی کے ساتھ یہ ضابطۂ اخلاق بھی وسیع اور پرتکلف ہوتا جائے گا''(۵۹)۔

یوں تمدّن اور اخلاق، شاہ ولی اللہ کے نزدیک ''فطری تعلق'' میں بندھے ہیں۔ انہیں الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

''سعادتِ دارین'' انسان کا حقیقی نصب العین:

شاہ ولی اللہ کی فکر میں بڑی جامعیت ہے۔ فلسفۂ اخلاق کی بحثوں میں انہوں نے اس موضوع کے سبھی اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ مثلاً.....اس کائنات میں انسان کے اَخلاقی نصب العین کے تعیّن میں وہ فطرتِ انسانی اور شریعتِ ربّانی دونوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ **نصب العین** کا تعیّن فکری اور عملی یکسوئی کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

انسان کا اخلاقی **نصب العین** ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اپنی بہیمیت کو مَلکیت کے تابع رکھے۔ بہیمیت سے مراد انسان کے جسمانی تقاضے اور قلبی جذبات ہیں۔ انسان کے جسمانی اور دنیاوی زندگی کے نظام کو قائم رکھنے کے محرّک یہی تقاضے ہیں۔ مَلکیت انسان کو اوپر کی طرف کھینچتی ہے اور جسمانی تقاضوں سے بلندتر ...... روحانی مسرّتوں اور قربِ الٰہی کی طلب میں اس کو بے قرار رکھتی ہے(۶۰)۔

شاہ ولی اللہ کے بقول یہ دونوں قوتیں ...... ہر انسان میں اور ہمہ وقت باہم کشمکش کرتی ہیں۔ بہیمیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مادی لذات و خواہشات کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ''وہ ایک کے بعد دوسرا تقاضا آراستہ کر کے اس کے سامنے لاتی ہے حتیٰ کہ انسان اپنی اصلی خصوصیت اور اپنی فطرت، جس میں ''لاھوت'' کی طرف توجہ ایک اہم عنصر ہے...... اس کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل میں شرع و رسم کی پرواہ بھی نہیں کرتا''(۶۱)۔ ایسے میں وہ شخص، جس کا **نصب العین** سعادت کا حصول ہے۔ وہ اس بہیمیت کی تادیب کرے گا اور اس کے تقاضوں کو مَلکیت کے تابع رکھنے کی کوشش میں مصروف رہے گا ...... یہی کشمکش ہے جو دنیا کی زندگی میں انسان کا اصل امتحان ہے۔

شریعت کی رو سے مادی اور جسمانی تقاضوں کا ترک کرنا نہ صرف مطلوب نہیں ہے...... بلکہ سخت ناپسندیدہ بھی ہے۔ اس دنیا کے نظام کو قائم رکھنا بھی شاہ صاحب کے خیال میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ کاموں میں سے ہے(۶۲)۔ کھانا پینا بقائے حیات کے لازمی تقاضوں میں سے ہے اور حیات، ناپسندیدہ نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی طویل عمر کو بھی اس کے لیے نافع بتایا (**لا یزید المؤمن عمرہ إلاّ خیرًا**)(۶۳) نکاح بقائے نوع کا ذریعہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔

یہی معاملہ جذبات و عواطف کا ہے۔ قلبِ انسانی محبت، غیرت و حمیت، غیظ و غضب، اور

غلبہٗ و تفوق کی خواہش جیسے جذبات کا مرکز ہے۔...... ان جذبات کو مَلکیت کے تابع کیا جائے...... محبت اللہ کے لیے ہو، نفرت اللہ کے لیے، منع و عطا بھی اسی کے لیے...... تو یہ ایمان کا کامل درجہ ہے (من احبّ للّٰہ و أبغض للّٰہ و اعطی للّٰہ و منع للّٰہ فقد استکمل الإیمان) (۶۴) اسی طرح غیرت، اگر حق کی خاطر ہو، غصہ اور غضب حق کی خاطر ہوں تو یہ عین مَلکی افعال ہیں اور سعادت دارین کے حصول میں مددگار۔

مَلکی تقاضوں کے حسبِ حال اعمال و اخلاق کا تعیّن بھی انسان پر نہیں چھوڑا گیا...... بلکہ عدل کے مطابق...... یعنی دین و دنیا کے سارے مصالح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کا تعین بھی فرما دیا گیا ہے۔ عبادات متعین ہیں۔ حقوق و فرائض متعین ہیں۔ وراثت میں صدقہ کی مقدار متعین ہے ...... وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے اس اخلاقی نصب العین کے حصول کا راستہ...... جس کے اختیار کرنے والوں کی قرآنِ مجید میں تعریف کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے لیے دنیا اور آخرت...... دونوں میں بھلائی ہے...... اور یہی سعادتِ عظمیٰ ہے۔

﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ٥ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ (۶۵).

انسانی اختیار کی حدود کے تعین کا مسئلہ:

فلسفۂ اخلاق سے دلچسپی رکھنے والے ایک اور اہم سوال پر بھی اپنی توجہ مرکوز کیے بغیر نہیں رہ سکتے...... یہ انسانی اختیار کی حدود کے تعیّن کا مسئلہ ہے۔ سید سلیمان ندویؒ اور سید مودودیؒ صراحت سے کہتے ہیں کہ مذاہب کا رجحان عام طور پر جبر کی طرف رہا ہے (۶۶)۔ قائلینِ جبریت نے اسے اپنی بے عملی اور اَخلاقی معاملات میں کوتاہیوں کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
جو چاہو سو آپ کرو ہو، ہم کو عبث بدنام کیا

اس مشکل معاملے میں شاہ ولی اللہ نے انتہائی متوازن نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ ان کے مطابق منصوبۂ کائنات میں اگرچہ اٹل قوانین کارفرما ہیں...... اور انسانی زندگی کے بہت سے معاملات بھی اگرچہ دائرہ تقدیر سے باہر نہیں ہیں...... لیکن اَخلاقی معاملات میں انسانی اختیار واضح ہے۔ وہ صاف سلیٹ کی طرح اپنے والدین کے پاس آتا ہے اور پھر اس کے ماحول اور خود اس کے اپنے کمائے ہوئے اعمال کے اثرات اس کے نفس و روح کے ساتھ وابستہ ہوتے جاتے ہیں(۶۷)۔

اس کے ساتھ جو ''**عہدِ الست**'' ہوا...... وہ بھی اختیار اس کی سرشت میں رکھے جانے کی گویا ''**تقریب**'' تھی(۶۸)۔ اس کی مسئولیت سے بھی واضح ہے کہ وہ اختیار کا حامل ہے۔ اسی لیے شاہ صاحب اخلاقی تربیت کی ضرورت پر بار بار توجہ دلاتے ہیں۔ مَلکیت کی ترقی کے لیے مسلسل خود احتسابی اور دل کو بیدار رکھنے کے لیے ذکر و دعا و استغفار کی تلقین کرتے ہیں...... تصور جزا و سزا کو انہوں نے ''عبرت کے دو ایسے تازیانے''(۶۹) قرار دیا کہ جن سے انسان سیدھی راہ پر قائم رہنے کے لیے خبردار رہتا ہے۔ **تذکیر بالموت** اور **ما بعد الموت** کو قرآنِ مجید کا اہم مضمون قرار دیا(۷۰)۔ ان آیات میں بار بار عمل کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور نعمتوں کو حسنِ عمل اور عذاب کو اعمالِ بد اور اَخلاقِ سیّئہ کے ساتھ وابستہ بیان کیا گیا ہے۔

اخلاق و معاشرت کا بیان...... چند نادر اصطلاحات:

شاہ ولی اللہ کے افکار کا مطالعہ کرتے ہوئے کچھ اصطلاحات و تعبیرات نادر اور مشکل محسوس ہوتی ہیں۔ یہ کچھ تو ان کے وسیع مطالعے اور مشاہدات کی وجہ سے ہے اور کچھ تصوف کے اثرات و واردات کے تحت۔

جہاں وہ کسی اصطلاح یا لفظ کو زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال کرتے ہیں...... وہاں عام طور پر تفصیلی تشریح کے ذریعے اس کی وضاحت بھی کرتے ہیں...... مثلاً فطرت، فطرت کے ظہور میں آنے کی راہ میں حائل حجابات (یعنی حجابِ طبیعت، حجابِ رسم اور حجابِ سوءِ معرفت وغیرہ) (۷۱) انسان کی قوتِ ملکیہ اور بہیمیہ اور پھر ان دونوں قوتوں کی ترکیب اور امتزاج کے اعتبار سے انسانی شخصیت کی مختلف اقسام وغیرہ (۷۲) تاہم نفسیات، فلسفے اور دین کے امتزاج سے انہوں نے ان اصطلاحات کو زیادہ بھرپور اور جامع انداز میں پیش کیا ہے اور یوں بظاہر ''بھاری بھرکم'' محسوس ہونے والے الفاظ کی کافی وشافی وضاحت کی ہے۔

مثلاً فطرت ہی کو لیجیے۔ اسے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بڑے وسیع مفہوم میں اور بڑی کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے (۷۳)۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان، ان کے خیال میں مخلوقاتِ ارضی کے چار درجے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے ان چاروں کی ''فطرت'' کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے، یعنی ان کی ضروریات و خصوصیات، ان کا طرزِ زندگی، داعیات، مقتضیات اور کردار و شخصیت کے مظاہر وغیرہ۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ اوپر کے ہر مرتبے میں نچلے درجے کی خصوصیات کا کچھ حصہ بھی شامل ہے اور کچھ مزید بھی۔ مثلاً جمادات سے اگلے درجۂ ترقی پر نباتات ہیں۔ جمادات کی طرح یہ حرکت نہیں کر سکتیں لیکن ان میں حیات، تغذیہ اور نشوونما کی صلاحیت ہے۔ ان سے اگلا درجہ حیوانات کا ہے۔ تغذیہ و نشوونما کے ساتھ ان میں حرکت کی قوت بھی ودیعت کی گئی ہے۔ حیوانات سے اگلا درجہ انسانوں کا ہے۔ اپنے اسی استدلال سے شاہ صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت میں حیوانی خصوصیات بھی رکھتا ہے گو وہ حیوانات سے کہیں بلند تر درجے کا مالک ہے (۷۴)۔

''فطرت'' ہی کی تشریح میں شاہ صاحب یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ مخلوقاتِ ارضی میں صرف انسان ہی اس قابل ہے اور صرف اسی کو ایسی فطری خصوصیات عطا کی گئی ہیں کہ وہ مخلوقات کا

بلند ترین شرف......یعنی درجۂ مَلکیت یا ''ملأ اعلیٰ '' سے اتصال کی صلاحیت حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے لیے اچھے بُرے اخلاقی کردار کا انتخاب کر سکتا ہے اور اس کے لیے کوشش اور جدوجہد کر سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی فطرت کی رہنمائی کا سامان عقل خداداد کے ذریعے بھی اور وحی الٰہی کے ذریعے بھی کیا گیا ہے (۷۵)۔

تصوّف اور تعمیرِ اخلاق:

نادر اور مشکل اصطلاحات میں سے کچھ کا تعلق تصوف سے ہے۔ شاید کسی کو بھی شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے صوفیانہ نظریات سے اختلاف نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ، اپنی کتاب ''تجدید و احیائے دین'' میں جہاں ان کے دیگر کارناموں کا اعتراف کرتے ہیں، وہیں یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو تصوّف شاہ صاحب نے پیش کیا'' وہ بجائے خود، اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے اور اس کی نوعیت ''احسان'' سے کچھ مختلف نہیں ہے''(۷۶)۔ لیکن اس کے باوجود سید مودودیؒ کو اس بات پر اعتراض ہے کہ انہوں نے...... ''متصوّفانہ اصطلاحات، رموز و اشارات اور متصوّفانہ طریقوں کو جاری رکھا''(۷۷)۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے زمانے کے حالات اور اصطلاحات سے کلیۃً بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ تصوّف شاہ صاحبؒ کے دور کا خاص رجحان تھا(۷۸)۔ انہوں نے خود تصوف کے پروردہ ایک گھرانے میں آنکھ کھولی (۷۸)۔ اپنے والدِ گرامی سے اس کی تعلیم حاصل کی اور عملی تربیت بھی پائی حتیٰ کہ تکمیلی منزل کو پہنچے اور لوگوں سے بیعت لینے کی ''اجازت'' بھی اوائلِ عمر ہی میں مل گئی(۸۰)۔ **حرمین شریفین** کے قیام کے دوران انہیں تمام **''سلاسلِ طریقت''** کا جامع ''خرقہ'' بھی عطا ہوا(۸۱)۔ یوں وہ تصوف کے ''فلسفے اور سلوک'' دونوں سے خوب آگاہ تھے جس کا اظہار ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے (۸۲)۔

اپنی ان تحریروں میں شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے جاہل صوفیوں پر کڑی تنقید کی۔ ان کے ترکِ دنیا کے رجحان کو ناپسند فرمایا اور دلائل سے ردّ کیا۔ شریعت کی حدود کی پرواہ نہ کرنے کی ان کی روش پر تنبیہ کی اور ان کے طرزِ عمل اور ''سلوک'' کی غلطیاں ان پر بلاخوف لومة لائم واضح کیں (۸۳)۔ اور ان کی یہ تنبیہ تو خاص طور پر لائقِ توجہ ہے کہ سوائے ان لوگوں کے، جو تصوف کا خاص ذوق اور فطری استعداد رکھتے ہیں، دوسرے لوگوں کے اس طریقے میں شامل ہونے کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔ ورنہ ایسے لوگ نہ دنیا کے رہ جاتے ہیں اور نہ اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل کر پاتے ہیں (۸۴)۔ ان ساری اصولی تنبیہات کے باوجود...... یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے افکار کا بڑا حصہ ''وجدان'' سے ماٴخوذ ہے۔ امہاتِ فضائل کے طور پر جو ''خصائلِ اربعہ'' وہ بیان کرتے ہیں...... ان کا کہنا ہے کہ ''علمِ لدنّی'' کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انہیں سمجھائے ہیں (۸۵)۔

پھر ان چاروں صفات کو جس طرح انہوں نے بیان کیا ہے، پہلی تین صفات، یعنی **طہارت، اخبات اور سماحت**...... یہ زیادہ تر **قلبی معاملات** کی اصلاح سے تعلق رکھتی ہیں...... مقصود یہ ہے کہ قلب کا رُخ درست ہو جائے، اعضاء و جوارح اس کی متابعت میں خود درست ہو جائیں گے...... یہی مقصودِ تصوف ہے اور یہی مقصودِ اخلاق۔

''عالمِ مثال'' اور اس کی تفصیلات بھی جو انہوں نے بیان کی ہیں۔ اس کے جن مشاہدات کا وہ تذکرہ کرتے ہیں...... یہ سب بھی ان کے وارداتِ باطنی سے ہی متعلق ہیں (۸۶)۔ علومِ تفسیر میں بھی انہیں اسی ذریعے سے خصوصی رہنمائی ملی جس کا تذکرہ انہوں نے الفوز الکبیر میں کیا ہے (۸۷)۔

یہ محض چند نمونے ہیں، ان کی مختلف کتب سے...... ورنہ فیوض الحرمین تو ہے ہی ان ہی تذکروں سے متعلق...... آج کے دور میں اگرچہ یہ اصطلاحات اور فنون اجنبی معلوم ہوتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو شاہ صاحبؒ جس ماحول میں پلے بڑھے، جس زبان اور جن اصطلاحات کا

ان کے دور میں رواج تھا......اور جو صوفیانہ واردات خود ان پر طاری ہوئیں، ان کے بیان اور اظہار کا اس سے بہتر پیرایہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی لکھتے ہیں:

''شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے افکار و آراء کو بسا اوقات اشارۂ غیبی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ الہام و القاء، رؤیا و منام اور روحانی ارشاد و ہدایت کے نہ صرف قائل ہیں، بلکہ ان کے داعی بھی ہیں۔ جدید ذہن اور معروضی فکر کے حاملین اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں..........مگر سوال اپنی جگہ قائم ہے...... آخر فکر و خیال کا سرچشمہ کہاں ہے؟ نئی بات کیا ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ نکتہ کیا ہے؟ اور کیسے ذہن میں آتا ہے؟ اسے ذہن کی کارفرمائی اور فکر کی کارسازی قرار دیا بھی جائے تو اس فکر اور اس ذہن کی باگ ڈور کس کے ہاتھوں میں ہے؟......شاہ صاحبؒ کا پختہ یقین ہے کہ یہ فکر و خیال کی دنیا عالمِ تکوینی سے بھی وابستہ، مربوط و مستفیض ہے''(۸۸)۔

ڈھائی تین صدیاں گزر جانے کے بعد (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) زبان و بیان، فکری اور عملی مسائل کی نوعیت اور بعض اصطلاحات و تعبیرات میں کچھ اجنبیت کا احساس فطری بات ہے۔ گزرے وقت کے اتنے فرق کے ساتھ عامّۃ النّاس کے لیے کچھ چیزیں آسان فہم نہیں رہتیں......لیکن اہم بات یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے افکار اب بھی تازہ ہیں اور اہلِ علم آج بھی ان کے خوشہ چین ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ Fall of the Mughal Empire, P: 117

۲۔ برِ عظیم پاک وہند کی ملتِ اسلامیہ، ص ۲۲۹

۳۔ الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں ”اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اہل عرب کو پاک کرے اور پھر اہلِ عرب کے ذریعے دوسرے تمام ممالک کی اصلاح کرے (الفوز الکبیر، ص ۴۸)، نیز ملاحظہ ہو عبید اللہ سندھیؒ کی کتاب.....قرآنِ پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے۔ ص ۴۱، جس میں انہوں نے تفصیل سے دعوتِ نبویؐ پر لبیک کہنے والے اہل عرب کی سیرت وکردار میں انقلاب، اور اس انقلاب کے باقی دنیا پر اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔

۴۔ تفہیم القرآن، ۱/۱۴

۵۔ تاریخِ دعوت وعزیمت، ۵/۱۷

۶۔ یونس ۱۰:۵۷

۷۔ مقدمہ فتح الرحمٰن، ص ۱

۸۔ التفهيمات الالٰهية، ۲/۲۴۵

۹۔ قاضی عیاضؒ اپنی کتاب ”الشفاء“ میں ایسے کئی واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں، ۱/۵۲۷، ۵۲۸، اور اسی طرح ابن اسحاق نے سیرت النبیؐ میں ۱/۲۵۳، ۲۷۸-۲۷۹ میں لکھا ہے۔

۱۰۔ **التفهيمات الالٰهية، ۲/۲۴۵**

۱۱۔ **الفوز الکبیر، ص ۴۰**

۱۲۔ **الفوز الکبیر، ص ۴۰، ۴۱**

۱۳۔ **الفوز الکبیر، ص ۳۵؛ التفهيمات الالٰهية، ۲/۱۳۴، ۱۳۵**

۱۴۔ **الفوز الکبیر**، ص۲۴ تا ۳۱

۱۵۔ علمائے یہود کی پیروی کرنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں ''آپ ان یہودی علماء کا نمونہ اس زمانے میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے ان غلط کوش اور غلط کار علماء کو دیکھئے جن کا مقصد صرف دنیا طلبی ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے بزرگوں کی تقلید کے عادی، اور کتاب و سنت کے واضح احکام کی طرف سے رُوگرداں ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں نے چند علماء کے اپنے ایجاد کردہ مسائل کو اختیار کرلیا ہے اور معصوم شارع کے کلام کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انہوں نے گھڑی ہوئی حدیثوں اور مہمل تاویلوں کو اپنا مقتدا اور رہنما بنا لیا ہے۔'' **الفوز الکبیر**، ص۳۲

۱۶۔ الفوز الکبیر، ص۱۳۰

۱۷۔ الفوز الکبیر، ص۶۸؛ مقدمہ اصولِ تفسیر (ابنِ تیمیہؒ)، ص۳۳

۱۸۔ الفوز الکبیر، میں مفصل بحث......ص۱۱۳ تا ۱۳۳

۱۹۔ الفوز الکبیر، ص۱۳۱

۲۰۔ الفوز الکبیر، ص۱۳۴

۲۱۔ تاریخِ دعوت وعزیمت، ۵/۱۷۷

۲۲۔ Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, P 202

۲۳۔ ہندوؤں میں زمانہ قبل مسیح میں ہی برہمنوں کی مذہبی رسومات پر اجارہ داری، مہنگی قربانیوں اور بے روح مذہبیت کے خلاف بغاوت کے طور پر تصوف کے رجحانات نے جنم لیا تھا جو آگے چل کر بڑے مقبول ہوئے اور ''وید'' کے ایک اہم حصے ''اپنشد'' کی بنیاد بنے۔

ملاحظہ ہو The Sacred Writings of the World's Religions, P 17

نیز......دنیا کے بڑے مذہب......ص۲۷، ۲۸

۲۴۔ تاریخِ دعوت وعزیمت، ۱۸۲/۵

۲۵۔ محاضراتِ حدیث، ص ۴۲۸؛ تاریخِ دعوت وعزیمت، ۳۵۸/۵ تا ۳۶۰

۲۶۔ القلم ۶۸:۴

۲۷۔ البدور البازغة، ص ۲۹۴

۲۸۔ حجۃ اللہ البالغہ ۲/۴۰۱ تا ۴۱۲

۲۹۔ حجۃ اللہ البالغہ ۲/۴۰۷

۳۰۔ صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب كثرة حيائه، حديث ۶۰۳۲، ص ۱۰۸۷

۳۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، شخصیت وحکمت کا ایک تعارف، ص ۳۷

۳۲۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۷، ۱۸

۳۳۔ ازالۃ الخفاء کی چاروں جلدوں میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ جہاں آپ نے خلفائے راشدین کے ہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اولین فریضۂ خلیفۃ المسلمین ثابت کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہوں صفحات ۴/۱۲۸؛ ۴/۲۸۶؛ ۳/۱۲۸-۱۲۹ وغیرہ۔

۳۴۔ البدور البازغة، ص ۱۱۰

۳۵۔ البدور البازغة، ص ۱۱۱

۳۶۔ ضربِ کلیم، ص ۶۰

۳۷۔ الفوز الکبیر، ص ۴۴

۳۸۔ ارتفاقات کے باب میں حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغة، میں شاہ صاحب نے اس پر مفصل بحث کی ہے ملاحظہ ہو جلد اول حجۃ اللہ البالغہ، ابوابِ ارتفاقات...... اور البدور البازغة، میں ارتفاقات اول تا رابع، مکمل باب......

۳۹۔ فلسفۂ یونان کے ماہرین صراحت کرتے ہیں کہ افلاطون کی یہ ’’یوٹو پیائی‘‘ ریاست حقیقی

نہیں ...... بلکہ محض تصوراتی ہے، مثلاً نعیم احمد لکھتے ہیں: ''افلاطون کے لیے ریاست کا تصور ایک مابعد الطبعیاتی تصور تھا...... (یہ ریاست) دنیائے تصورات میں پائی جاتی ہے۔ یہ ریاست اگرچہ مطلقاً حقیقی ہے لیکن اس کا حصول ممکن نہیں کیونکہ وہ ایک ماورائی دنیا میں ہے۔'' (تاریخ فلسفۂ یونان از نعیم احمد، ص۱۴۰-۱۴۱)، اسی طرح کے تبصرے دیگر مصنفین نے بھی کیے ہیں مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ فلسفہ از ویبر ص۸۴-۸۵، اور ول ڈیورانٹ کی کتاب ہیروز آف ہسٹری (اردو ترجمہ)، ص۱۱۸

۴۰۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۲۹۹

۴۱۔ جامع الترمذی، رقم الحدیث ۳۹۵٦، ۵/۷۳۵

۴۲۔ البدور البازغة، ص۳۵۷ تا ۳۶۲ بعنوان ملتِ عالیہ کا بیان، ...... مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص۲۴۳، ۲۴۴؛ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۲۹۹ تا ۳۰۲

۴۳۔ شاہ ولی اللہ کا فلسفۂ عمرانیات و معاشیات، ص۴۵

۴۴۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۳۰۳

۴۵۔ مغربی علوم و فنون، خاص طور پر سیاسی و معاشرتی افکار کے اس تشکیلی دور کا ایک جامع تذکرہ سید مودودیؒ نے اپنی کتاب ''تجدید و احیائے دین'' میں بھی کیا ہے۔ (ص۱۲۲ تا ۱۲۸)

۴٦۔ اسلام کا معاشرتی نظام، ص۳

۴۷ افکارِ اقبال، ص۹۱، ۹۲

۴۸۔ تجدید و احیائے دین، ص۱۱۲

۴۹۔ Muslims the First Sociologists, p 87

۵۰۔ The Elements of Moral Philosophy: James Rachels, University of Albama-Birmingham P 47.

۵۱۔ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین، حدیث ۱۳۸۵، ص ۱۰۸

۵۲۔ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ، ۱۴۷/۱

۵۳۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ (سندھی)، ص ۳۳

۵۴۔ شاہ صاحب نے اس پر مختلف فصول کے تحت ایک طویل بحث کی ہے، حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول......چھٹی بحث، بعثتِ انبیاء کی ضرورت

۵۵۔ البدور البازغۃ، ص ۳۰۵ تا ۳۰۷

۵۶۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۲۰۵/۲؛ البدور البازغۃ، ص ۳۰۸

۵۷۔ الحدید ۲۷:۵۷

۵۸۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۳۰۵/۱ (تلخیص)

۵۹۔ اخلاقیاتِ اجتماعیہ اور ان کا فلسفہ، ص ۳۰

۶۰ حجۃ اللہ البالغہ، ۲۱۶/۱ تا ۲۱۸

۶۱۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۳۳۵/۱؛ البدور البازغۃ، ص ۲۹۰، ۲۹۱

۶۲۔ لمحات، ص ۵۱؛ حجۃ اللہ البالغہ، ۵۳۰/۱

۶۳۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب کراھۃ تمنی الموت، حدیث ۶۸۱۹، ص ۱۱۴۵

۶۴۔ سنن ابی داؤد، ۴۶۸۱، ۶۳۲/۲

۶۵۔ البقرۃ ۲۰۱:۲، ۲۰۲

۶۶۔ مسئلہ جبر وقدر، ص ۶۱؛ سیرت النبیؐ، ۴۶۳/۴

۶۷۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۲۲۴/۱

۶۸۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۵۴/۲

۶۹۔ البدور البازغة، ص۴۰۱

۷۰۔ **الفوز الکبیر** میں لکھتے ہیں ”چونکہ گزشتہ انبیاء نے عقیدۂ آخرت اور حشر و نشر کا تذکرہ شرح و تفصیل کے ساتھ نہیں کیا۔ اسی وجہ سے (قرآن کے اوّلین مخاطبین) مشرکین عرب اس عقیدے سے واقف نہیں تھے اور اسے فہم سے بعید سمجھتے تھے۔ ص۱۹

۷۱ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۳۳۵ تا ۳۳۸؛ البدور البازغة، ۲۹۰ تا ۲۹۴

۷۲۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۲۱۵ تا ۲۲۲

۷۳۔ البدور البازغة، ص۲۴۳، ۲۹۰؛ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۲۴۵، ۳۱۵، ۳۱۶

۷۴۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۱۹۵، ۱۹۶

۷۵۔ البدور البازغة میں مفصل بیان، تیسرا مقالہ، فصلِ پنجم، علمِ تشریع اور اس کے قوانین، ص۳۸۱، ۳۸۳

۷۶۔ تجدید و احیائے دین، ص۱۱۹

۷۷۔ ایضاً

۷۸۔ التفهیمات الالٰهیة میں لکھتے ہیں ”(ہمارے دور میں) صوفیوں کے اقوال و افعال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں۔ ان کے رموز و اشارات اس قدر دخل پا گئے ہیں کہ جو شخص ان رموز و اشارات کا انکار کرے یا ان سے خالی ہو، نہ وہ مقبول ہوتا ہے، نہ صالحین میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ منبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جس کی تقریر اشاراتِ صوفیہ سے پاک ہو اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں خوض اور اعتقاد کا اظہار نہ کرے ورنہ اس کا شمار گدھوں میں ہونے لگتا ہے۔“ (ص۸۲-۸۳)

۷۹۔ رود کوثر ۵۶۵؛ انفاس العارفین میں شاہ صاحب نے اپنے خاندان کے ان صوفی بزرگوں کے احوال تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

۸۰۔ انفاس العارفین، ص۸۳

۸۱۔ انفاس العارفین، ص۲۰۷

۸۲۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ شخصیت و حکمت کا ایک تعارف، ص۲۲

۸۳۔ الطاف القدس، ص۱۳۷

۸۴۔ الطاف القدس، ص۱۶

۸۵۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۳۲۳

۸۶۔ الخیر الکثیر، ص۲۰۶؛ حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۱۶۴

۸۷۔ الفوز الکبیر، ص۱۴۱

۸۸۔ شاہ ولی اللہ کی خدماتِ حدیث، ص۱۹

مصادر و مراجع

۱۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، السجستانی، السّنن (الکتب الستۃ)، دار السّلام للنّشر والتوزیع، الرّیاض، ۱۹۹۹ء

۲۔ البخاری، محمد بن اسمٰعیل، ابوعبداللہ، الجامع الصّحیح للبخاری۔ (الکتب السّتۃ) دار السلام للنّشر والتوزیع، الرّیاض، ۱۹۹۹ء

۳۔ بشیر احمد، شیخ، شاہ ولی اللہ کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات، مکی دار الکتب، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۴ء

۴۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ، الجامع الصّحیح، (الکتب الستۃ)، دار السلام للنشر والتوزیع، الرّیاض، ۱۹۹۹ء

۵۔ حسن ریاض، سید، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۸۴ء

۶۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۵ء

۷۔ سندھی، عبید اللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، المحمود اکیڈمی، لاہور، س۔ن

۸۔ شاہ ولی اللہ محدث، دہلوی، الخیر الکثیر، (ترجمہ عابد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی، قرآن محل مولوی مسافر خانہ، کراچی، س۔ن

۹۔ شاہ ولی اللہ محدث، دہلوی، الطاف القدس فی معرفة لطائف النفس، (ترجمہ عبد الحمید سواتی)، ادارہ نشر و اشاعت، مدرسہ نصرت العلوم، گوجرانوالہ ۱۹۶۴ء

۱۰۔ شاہ ولی اللہ محدث، دہلوی، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، (ترجمہ سید محمد مہدی الحسنی، حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی)، قرآن محل، مولوی مسافر خانہ، کراچی، ۱۹۸۲ء

۱۱۔ شاہ ولی اللہ محدث، دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، (اردو ترجمہ مولانا عبد الرحیم) قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۲۔ شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی، لمحات، (ترجمہ پیر محمد حسن)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۶ء

۱۳۔ شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی، قطب الدین، فتح الرّحمن، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، س۔ن

۱۴۔ شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی، البدور البازغة، (عربی)، (تحقیق صغیر حسن المعصومی)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد، سندھ، ۱۹۷۰ء

۱۵۔ شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی، التفہیمات الالٰہیة، (مرتب مولوی محمد اسحاق نگینوی)، مقبول پریس دہلی، س۔ن

۱۶۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضراتِ حدیث، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۴ء

۱۷۔ قاضی عیاض اندلسی، کتاب الشفاء، (ترجمہ عبدالحکیم اختر شاہجہان پوری)، مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۸۔ قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر، برِعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء

۱۹۔ کلیاتِ اقبال (مرتب) جاوید اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، مئی ۱۹۷۵ء

۲۰۔ محمد اکرام، شیخ، رودِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء

۲۱۔ محمد حامد، افکارِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان، ۱۹۸۶ء

۲۲۔ مسلم بن حجاج القشیری، الامام، الجامع الصحیح للمسلم، (الکتب الستۃ)، دار السّلام للنشر و التوزیع، الرّیاض، ۱۹۹۹ء

۲۳۔ مودودی ابوالاعلیٰ، سید، تجدید و احیائے دین، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

۲۴۔ مودودیؒ ابو الاعلیٰ سید، مسئلہ جبر و قدر، اسلامک پبلی کیشنز، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، ۱۹۹۶ء

۲۵۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۰ء

۲۶۔ مودودیابو الاعلیٰ سید، اخلاقیاتِ اجتماعیہ اور ان کا فلسفہ، (مرتب محمد خالد فاروقی)، الاخوان پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۰ء

۲۷۔ ندوی، ابو الحسن علی، مولانا، تاریخ دعوت و عزیمت، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، س۔ن

۲۸۔ ول ڈیورانٹ، ہیروز آف ہسٹری، (اردو ترجمہ یاسر جواد) نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۹۔ ھالے پوتہ، ڈاکٹر عبدالواحد، شاہ ولی اللہ کا فلسفہ، (ترجمہ سید محمد سعید)۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد، پاکستان، ۱۹۷۴ء

۳۰۔ یسین مظہر، محمد، صدیقی، ڈاکٹر، شاہ ولی اللہ دہلوی، شخصیت وحکمت کا ایک تعارف، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء

۳۱۔ یٰسین مظہر، محمد، صدیقی، ڈاکٹر، شاہ ولی اللہ کی خدماتِ حدیث، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، مظفر نگر انڈیا، ۲۰۰۴ء

32. Aziz Ahmad. Studies in Islamic Culture in Indian environment - Oxford University Press. Pakistan. 1970.

33. Basharat Ali- Dr., Muslims the First Sociologists. Maktab-i-Milliya - Urdu Bazar - Lahore. 1961.

34. James Rachels. The Elements of Moral Philosophy - University of Albama-Birmingham.

35. S.E. Frost. The Sacred Writings of the World's Religions. Perma Giants - New York 1949.

36. Sarkar - Jadu Nath, Aurang Zeb, Fall of the Mughal Empire - M.C. Sarkar and Sons - 14 Bankin chatterjee street - Calcutta. 1964.